اختر الایمان کی نظم 'ایک لڑکا'

پروفیسر شہناز نبی

اختر الایمان کی نظم 'ایک لڑکا' میں ایسے لڑکے کی تصویر ملتی ہے جو اپنی تلاش میں سرگرداں ہے۔ ایک امریکی مصنف Annie Dillard، کا کہنا ہے کہ ایک کتاب کا کام یہ ہے کہ وہ ایک کلہاڑے کی طرح ہمارے اندر جمی ہوئی برف کو کاٹ سکے۔ اختر الایمان کی کتاب 'یادیں' کم وبیش یہی کام کرتی ہے۔ اس مجموعے کی تقریباً تمام نظمیں ہمیں سوال کرنے پر مجبور کرتی ہیں اور نظم کی تہوں میں چھپے ہوئے اسرار کو باہر لانے پر اکساتی ہیں۔ نظم 'ایک لڑکا' اختر الایمان کی ایسی ہی ایک نظم ہے جس میں انسان کی ذات اور اس کی شخصیت سے خارجی دنیا کے ٹکراؤ کا منظر نامہ پیش کیا گیا ہے۔ نظم کچھ اس طرح شروع کی جاتی ہے کہ اس کے شروع ہوتے ہی تحیر کا آغاز ہوتا ۔ مختلف جگہوں اور مقامات کا ذکر کرنے کے بعد شاعر یہ انکشاف کرتا ہے کہ ان تمام جگہوں پر کوئی اس کا تعاقب کر رہا ہے۔

دیارِ شرق کی آبادیوں کے اونچے ٹیلوں پر
کبھی آموں کے باغوں میں، کبھی کھیتوں کی مینڈوں پر

کبھی جھیلوں کے پانی میں، کبھی بستی کی گلیوں میں
کبھی کچھ نیم عریاں کم سنوں کی رنگ رلیوں میں
سحر دم جھٹپٹے کے وقت، راتوں کے اندھیرے میں
کبھی میلے میں، ناٹک ٹولیوں میں، ان کے ڈیرے میں
تعاقب میں کبھی گم تتلیوں کے سونی راہوں میں
کبھی ننھے پرندوں کی نہفتہ خواب گاہوں میں
برہنہ پاؤں، جلتی ریت، یخ بستہ ہواؤں میں
گریزاں بستیوں سے، مدرسوں سے خانقاہوں میں
کبھی کم سن حسینوں میں، بہت خوش کام و دل رفتہ
کبھی پیچاں بگولہ سا، کبھی جیوں چشمِ خوں بستہ
ہوا میں تیرتا، خوابوں میں بادل کی طرح اڑتا
پرندوں کی طرح شاخوں میں چھپ کر جھولتا، مڑتا
مجھے اک لڑکا، آوارہ منش، آزاد سیلانی
مجھے اک لڑکا جیسے تند چشموں کا رواں پانی
نظر آتا ہے، یوں لگتا ہے جیسے یہ بلائے جاں
مرا ہم زاد ہے، ہر گام پر، ہر موڑ پر جولاں
اسے ہمراہ پاتا ہوں، یہ سائے کی طرح میرا
تعاقب کر رہا ہے، جیسے میں مفرور ملزم ہوں
یہ مجھ سے پوچھتا ہے اختر الایمان تم ہی ہو۔؟

نظم سے ایک طویل بند کو درج کرنے کی وجہ یہ ہوئی کہ اختر الایمان کی نظم کو آپ آسانی کے ساتھ کہیں سے بھی کاٹ نہیں سکتے۔ ان کے مصرعے آپس میں یوں مربوط ہیں کہ پورا بند نہ پڑھا جائے تو مزہ نہیں آتا۔ اختر الایمان کی نظم کو آپ اسی

طرح سے پڑھ سکتے ہیں جیسا کہ وہ چاہتے ہیں۔ بیچ بیچ سے کئی شعروں کو کم کیا جا سکتا ہے لیکن اس سے نظم کی روانی میں فرق آ سکتا ہے اور مفہوم کی ادائیگی بھی پورے طور پر نہیں ہو پائے گی۔ اختر الایمان کی نظموں کی یہ ایک بڑی خاصیت ہے جو انہیں دوسرے نظم گو شاعروں سے ممتاز اور الگ کرتی ہے۔

نظم 'ایک لڑکا' کے شروع ہوتے ہی ایک کہانی کا آغاز ہوتا ہے۔ شاعر ایک قصہ گو کی طرح کہانی سنانے کے موڈ میں ہے۔ پہلے بند سے ہی تفصیلات کا سیلاب ہے۔ شاعر بتانا چاہتا ہے کہ کہاں کہاں کوئی اس کا تعاقب کر رہا ہے۔ دراصل یہ سارے مقامات شاعر کے دیکھے بھالے ہیں۔ اس نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ ان راستوں، گلیوں، کھیتوں، مینڈوں، باغوں، جھیلوں کے درمیان گذارا ہے۔ وہ ایک آزاد منش، سیلانی رہا ہے۔ اس کی زندگی خوش باشیوں میں گذری ہے۔ کبھی وہ ہواؤں میں تیرتا ہے تو کبھی بادلوں میں اڑتا ہے، کبھی پرندوں کی طرح شاخوں سے الجھتا ہے تو کبھی چشموں کے رواں پانی سا بہتا ہے۔ جسے شاعر اپنے تعاقب میں پاتا ہے وہ شاعر کا 'میں' ہے۔ اس لئے شاعر اسے پہچانتا بھی ہے اور نہیں بھی۔ وہ اسے اپنا ہمزاد کہتا تو ہے لیکن اس کا ہمزاد شاعر کا تعاقب اس لئے کر رہا ہے کہ وہ شاعر تک پہنچنا چاہتا ہے۔ وہ یہ جاننا چاہتا ہے کہ وقت نے شاعر کو کہاں کہاں کتنا توڑا مڑوڑا ہے۔ ہر بند کے خاتمے پر شاعر کے ہمزاد کا اس سے یہ سوال کرنا کہ کیا وہی اختر الایمان ہے، اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وقت کے ہاتھوں مجبور ہونے والے شاعر میں کچھ ایسی تبدیلیاں آ گئی ہیں کہ اس کا ہمزاد بھی اسے پہچاننے سے قاصر ہے۔

چونکہ شاعر نے نظم کے پہلے بند سے ہی قصہ گوئی کا رنگ اختیار کیا ہے اس لئے قاری اس کے اختتام سے واقف ہونے کے لئے تذبذب اور کشمکش کا شکار ہونے لگتا ہے۔ ایک امریکی کلیہ ساز Kenneth Burke کا کہنا ہے کہ کہانیاں ہماری زندگی کے لئے بے حد ضروری ہیں۔ یہ ہمیں آراستہ و پیراستہ کرتی ہیں۔

ہمارے لئے یہ اسی طرح ضروری ہیں جس طرح کہ کھانا پینا اوڑھنا بچھونا وغیرہ۔ ہم ایک سماج میں رہتے ہیں اور سماج میں ہمیں ایک دوسرے سے جوڑنے کا کام یہ کہانیاں ہی کرتی ہیں۔ یہ کسی بھی شکل اور ہئیت میں ہوں، ہمیں ایک دوسرے کو سمجھنے میں مدد دیتی ہیں۔ غالباً اسی لئے اختر الایمان نے وقت کے ہاتھوں شکست وریخت سے گذرنے والے انسان اور اس کی مجبوریوں کو بتانے کے لئے کہانی کا سہارا لیا ہے۔ ایک بہتر زندگی کی طرف مراجعت کرنے کے لئے بھی کہانیاں ضروری ہوتی ہیں۔ ماہرینِ نفسیات کا کہنا ہے کہ انسان جن حالات سے گذر رہا ہوتا ہے، اسے بیان کرنے سے بہتر زندگی کے امکانات پیدا ہو سکتے ہیں۔ Carol S. Pearson اور Hugh K. Marr کے مطابق انسانوں کو اپنی زندگی کا خود ہی محاسبہ کرنا چاہئے تا کہ وہ آئندہ زندگی کو سنوار سکیں۔ ان دونوں نے بارہ عدد آرکی ٹائپل پیٹرن بنائے جن کے مطابق انسان اپنا امتحان لے سکتا ہے اور اپنی زندگی کی کہانی کو پرکھ سکتا ہے۔ یہ ان لاشعوری اثرات کا جائزہ لینے کی کوشش ہے جو انسان کی زندگی کا ڈھب بدلتے رہتے ہیں۔ اگر انسان ان اثرات کا پتہ لگا لے تو وہ جینے کا بہتر طریقہ اپنا سکتا ہے۔

اختر الایمان کی اس نظم میں شاعر کہانی بیان کرتے ہوئے کردار سازی بھی کرتا جاتا ہے جس سے یہ اندازہ ملنے لگتا ہے کہ وہ شخص جو شاعر کا پیچھا کر رہا ہے اور جو دراصل شاعر ہی ہے، ایک خوش فکر اور خوش باش انسان ہے۔ اس نے زندگی کو قریب سے دیکھا ہے اور فطرت سے اس کا گہرا واسطہ رہا ہے۔ وہ انسانی زندگی کی نیرنگیوں کا گواہ بنا اور دنیا کے تجربات کو دامن میں سمیٹے گذرتا گیا۔ لیکن عمر کے کسی مقام پہ وہ اپنے ہمزاد سے دوچار ہو رہا ہے جو اس سے ہر گام، ہر موڑ پہ ایک ہی سوال کر رہا ہے کہ وہ اختر الایمان ہے یا نہیں۔ نظم کا قاری اس لڑکے سے واقف ہو چکا ہے جس کی تلاش شاعر یا شاعر کے ہمزاد کو ہے۔

نظم کے دوسرے بند میں ہم اس کردار سے مزید متعارف ہوتے ہیں۔ یہ کردار خدائے عزوجل پر پورا ایمان رکھتا ہے۔ وہ اس بات کا معترف ہے کہ خدا نے ہی یہ دنیا بنائی ہے۔ یہ زمین و آسمان اسی کی تخلیق ہیں۔ اسی نے چاند، سورج، ستارے بنائے۔ وہی سیاروں اور ستاروں کے درمیان مناسب فاصلہ مقرر کرتا ہے۔ وہی چٹانیں چیر کر دریا نکالتا ہے اور ہواؤں کو خوشبوؤں سے معمور کرتا ہے۔ اسی نے سمندر مونگوں اور موتیوں سے بھرے ہیں اور وہی کانوں کو معدنیات سے مزین کرتا ہے۔ اسی خدائے واحد نے انسان کو عقل و دانش عطا کی۔ اسی کے طفیل انسان خود کو پہچان پایا ہے۔ خدا کی کوئی بات حکمت سے خالی نہیں۔ اس لئے اس کی ذاتِ با برکت پہ اپنا ایمان قائم رکھتے ہوئے شاعر یہ کہتا ہے کہ اگر خدا نے لئیموں کو خسروی دی اور اسے نکبت کا شکار بنایا تو اس کا بھید وہی جانے۔ اگر ہرزہ کار تونگر ہوتے گئیا ور وہ دریوزہ گر رہ گیا تو اس مصلحت سے بھی خدا ہی واقف ہے۔ شاعر تو بس اتنا جانتا ہے کہ جب جب اس نے کسی کے سامنے دامن پسارا ہے، اس کا ہمزاد سامنے آ کھڑا ہوتا ہے اور پوچھتا ہے کہ کیا تم ہی اختر الایمان ہو۔؟

نظم کے تیسرے بند میں شاعر ترقی پسندوں کے خطابیہ لہجے میں قاری کو صورتِ حال سے واقف کرانا چاہتا ہے۔ وہ بتانا چاہتا ہے کہ 'معیشت دوسروں کے ہاتھ میں ہے۔' اس لئے دوسرے پڑھے لکھے مفلسوں کی طرح اس کے پاس بھی اک 'ذہنِ رسا' کے سوا کچھ بھی نہیں۔ وہ ایک مجبور انسان ہے۔ وہ طبقاتی تفریق کی بہترین مثال ہے۔ اور طبقاتی تفریق کو مٹانا آسان نہیں۔ بہت ممکن ہے کہ زندگی کی آخری سانسوں تک اسے اس جبر و قہر کا شکار ہونا پڑے اور وہ اپنی زندگی کو اپنی طرح بنانے اور سنوارنے کے بجائے دوسروں کی طرح گذارنے پر مجبور کر دیا جائے۔ بہت ممکن ہے کہ اسے اپنی ذہانت کو کم قیمت پہ بیچنا پڑے۔ اس کے علم و دانش کے نمونے کسی اور کی جاگیر بنیں اور وہ مٹھی پر پیسوں کی خاطر اپنی فکر کا سودا کر کے مسکراتا رہے۔

معیشت دوسروں کے ہاتھ میں ہے، میرے قبضے میں
جزاک ذہنِ رسا کچھ بھی نہیں، پھر بھی مگر مجھ کو
خروشِ عمر کے اتمام تک اک بار اٹھانا ہے
عناصر منتشر ہو جانے، نبضیں ڈوب جانے تک
نوائے صبح ہو یا نالۂ شب کچھ بھی گانا ہے
ظفر مندوں کے آگے رزق کی تحصیل کی خاطر
کبھی اپنا ہی نغمہ ان کا کہہ کر مسکرانا ہے
وہ خامہ سوزی شب بیداریوں کا جو نتیجہ ہو
اسے اک کھوٹے سکے کی طرح سب کو دکھانا ہے

ان تمام نا مساعد حالات میں شاعر کا اپنے آپ سے بیزار ہونا کوئی عجیب نہیں۔ وہ خود کو ایک آبلہ سمجھتا ہے جو کسی بھی وقت پھوٹ سکتا ہے۔ اس کی بے بسی کا یہ عالم ہے کہ شکست وریخت کے شدید کرب سے گذرنے کے علاوہ وہ کچھ نہیں کر سکتا۔ اس کا ان حالات پر کوئی اختیار نہیں جو اسے ایک تنکے کی طرح بہائے لئے جا رہے ہیں۔ وہ صبح کی تلاش میں شب کا دامن تھامنے لگتا ہے تو اس عالم میں ایک بار پھر اس کا ہمزاد اس کی شخصیت اور اس کے وجود پر سوالیہ نشان لگا دیتا ہے۔ اس مسلسل تکرا راور سوال پر شاعر جھلا اٹھتا ہے

یہ لڑکا پوچھتا ہے جب تو میں جھلا کے کہتا ہوں
وہ آشفتہ مزاج، اندوہ پرور، اضطراب آسا
جسے تم پوچھتے رہتے ہو کب کا مر چکا ظالم
اسے خود اپنے ہاتھوں سے کفن دے کر فریبوں کا
اسی کی آرزوؤں کی لحد میں پھینک آیا ہوں
میں اس لڑکے سے کہتا ہوں وہ شعلہ مر چکا جس نے

کبھی چاہا تھا اک خاشاکِ عالم پھونک ڈالے گا

گویا اب ہم نظم کے کلائمکس تک آ پہنچے ہیں۔ وہ کردار جس کی تشکیل نظم کی ابتدا سے ہی شاعر کر رہا تھا، وہ بالآخر اک منفی کردار ثابت ہوتا ہے۔ وہ ایک ایسا کردار ہے جو حالات کا شکار ہو چکا ہے۔ ایک ایسا منفعل اور مجہول کردار جو زندگی سے لڑنے کے بجائے اس کے آگے سپر ڈال چکا ہے۔ جس کی تدفین کا مرحلہ شروع ہو چکا ہے۔ فریبوں کے کفن میں لپٹا یہ مردہ جسم اپنی ہی آرزوؤں کی لحد میں پیوندِ زمیں ہونے کو تیار ہے کہ انتہائی ڈرامائی انداز میں آخری شعر یوں لکھا جاتا ہے

یہ لڑکا مسکراتا ہے، یہ آہستہ سے کہتا ہے

یہ کذب و افترا ہے، جھوٹ ہے، دیکھو میں زندہ ہوں

اور اس طرح اپنے زندہ ہونے کے اعلان کے ساتھ شاعر نظم کا خاتمہ کر دیتا ہے۔ گویا یہ اس قصے کا Happy Ending ہے جس کی ابتدا سے ہی قاری تذبذب میں مبتلا تھا کہ

دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

اختر الایمان کی یہ نظم کسی بھی ایسے شخص کی زندگی کا احاطہ کرتی ہے جو طبقاتی تفریق کا شکار ہے اور جو اپنی تمام تر نیک نیتی اور عزت نفس کے باوجود ایک ایسی زندگی گذارنے پر مجبور کر دیا جاتا ہے جو وہ خود نہیں چاہتا۔ نامساعد حالات انسان کو اتنا بے بس کر دیتے ہیں کہ وہ اپنے اصولوں سے سمجھوتہ کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ ایسے میں وہ وقتی منفعت تو پا جاتا ہے لیکن اس کا ضمیر (اگر زندہ ہے تو) اسے کچوکے لگاتا رہتا ہے۔ اس کی کچلی ہوئی آتما اسے لعن طعن کرتی رہتی ہے۔ وہ اپنی بے کسی پر اندر اندر کڑھتا رہتا ہے۔ اس کا 'میں' جو اس کی زندگی میں کبھی آزادہ روی، خوشیوں اور مسرتوں کا سرچشمہ ہوا کرتا تھا، دھیرے دھیرے بجھنے لگتا ہے۔ اس کی خوش دلی اور زندگی سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت ماند پڑنے لگتی ہے۔ وہ جس نے کبھی فطرت

سے ہم آہنگی پیدا کی تھی، فطرت سے دور ہونے لگتا ہے۔ بچپن کی خوش وخرم طبیعت اندوہ گینی پر مائل ہو جاتی ہے۔ حقیقت کے سفاک ہاتھ اسکے خوابوں کا محل چکنا چور کر دیتے ہیں۔ اس کی شگفتگی محزونی سے بدل جاتی ہے۔ نیکی، ایمانداری، شرافت، نجابت، دوستی، رفاقت، غرض ہر حسین شئے پر سے اس کا ایمان اٹھ جاتا ہے۔ لیکن تذبذب کے اس عالم میں اس کا ہمزاد بار بار اس سے اس کے ہونے کی گواہی مانگتا ہے۔ اختر الایمان کی یہ نظم ان لوگوں کے لئے ایک تازیانہ ہے جو اپنے ضمیر کو تھپک تھپک کر گہری نیند سلا دیتے ہیں۔ جن کا 'میں' ان کے اندر مر چکا ہے اور جو کبھی ان سے کوئی سوال نہیں کرتا۔ اس نظم میں ناگفتہ بہ حالات کا شکار ایک انسان اگر اپنے ہونے کا احساس قائم رکھ پایا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آثار خوش آئند ہیں۔ دنیا اور زمانے کو بدلنے سے پہلے اگر استبداد کا شکار ایک انسان خود کو بدل سکتا ہے تو یہی بہت ہے۔ اختر الایمان کی یہ نظم ایسے لوگوں کو اپنی سوچ بدلنے کا سلیقہ سکھاتی ہے جو خود کو وقتی طور پر مضمحل اور شکست خوردہ محسوس کرنے لگے ہیں۔ ہر بڑی شاعری ہمیں خود کو بدلنے پر مجبور کرتی Robert Housden کہتا ہے

"great poetry can alter the way we see ourselves. It can change the way we see the world. You may neverhave read a poem in your life, and yet you can pick up a volume, open it to any page, and suddenly see your own original face there..."

اختر الایمان کی اس نظم میں جس لڑکے کی کہانی بیان کی گئی ہے وہ ایک متوسط گھرانے کا فرد ہے۔ بچپن میں وہ بے فکرا اور لاابالی ہے لیکن زندگی کی حقیقتیں دھیرے دھیرے اس پر واضح ہوتی ہیں تو وہ ان پر سنجیدگی سے غور کرنے لگتا ہے۔ وہ

عام معاشرتی نظام کا حصہ بننے لگتا ہے۔ اسے رشتوں کے کاروباری ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ سیاسی و اقتصادی صورتِ حال میں وہ خود کو جکڑا ہوا پاتا ہے۔ خدا پر اس کا کامل یقین ڈگمگانے لگتا ہے۔ یہاں تک کہ اپنے وجود پر سے بھی اس کا اعتبار اٹھنے لگتا ہے۔ سارے رشتے مصنوعی اور میکانکی معلوم ہونے لگتے ہیں۔ اسے لگتا ہے جیسے وہ ایک سماج کا نہیں بلکہ ایک بازار کا حصہ ہے جہاں ہر شئے بکاؤ ہے۔ یہاں تک کہ اس کی فکر اور فن بھی۔ اس کے سماجی روابط ٹوٹنے لگتے ہیں۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ایک غیر فطری زندگی گذارنے پر مجبور کر دیا جاتا ہے۔ قدروں کی شکست و ریخت اسے ایسے مقام پر لے آئی ہے جہاں اسے اپنا چہرہ پہچاننے میں دقت محسوس ہوتی ہے۔ اسے لگتا ہے کہ وہ نہ صرف دوسروں کو دھوکہ دے رہا ہے بلکہ اپنے آپ سے بھی فریب کر رہا ہے۔ معاشرتی عدمِ توازن کی وجہ سے سماج میں جو خرابیاں پیدا ہو چکی تھیں اس کے اثرات اس لڑکے پر پڑ چکے تھے۔ اختر الایمان کے دور کو مدِ نظر رکھیں تو یہ بات صاف سمجھ میں آتی ہے کہ پہلی اور دوسری جنگِ عظیم کے بعد جس طرح کے سیاسی اور سماجی حالات پیدا ہوئے وہ نراجیت کے غماز تھے۔ اس نراجیت نے انسان کے جذبات و احساسات کو شدید کرب سے دوچار کیا۔ اس کرب نے اسے مضمحل ضرور کر دیا ہے لیکن اس کے حواس بالکل معطل نہیں ہوئے ہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو اس کے اندر کا 'میں' مر چکا ہوتا۔ اپنے زندہ ہونے پر اس کا اصرار دراصل اس نئی حسیت کا غماز ہے جو کسی بھی دور کے مروجہ سیاسی، سماجی اور اقتصادی نظام سے نبرد آزما ہونے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

اختر الایمان پہ ترقی پسندی کا لیبل چسپاں کئے بغیر یہ بات قطعیت کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ اختر الایمان کی اس نظم میں زندگی سے لڑنے کا ایک واضح اشارہ ملتا ہے۔ ایک طرف حقیقت کا ادراک ہے تو دوسری طرف ضمیر کے زندہ ہونے کا احساس۔ یہ انسان کا ضمیر ہی ہے جو اسے نامساعد حالات میں بھی سمجھوتے سے

انکار پر آمادہ کرتا ہے۔اور سمجھوتہ، وہ بھی کس سے۔؟ جن لئیموں کی بات شاعر اس نظم میں کرتا ہے، انہوں نے انسانی زندگی سے قدروں کی معنویت کو باہر نکال پھینکا ہے۔ ہر طرف بے حسی اور لاتعلقی ہے۔ انسانی رشتوں کے تقدس کی پامالی ہے۔ سیاست دانوں اور سرمایہ داروں نے ایسے حربے اپنائے ہیں کہ انسان اپنی ضرورتوں سے تنگ آ کر اپنے ضمیر کا سودا کر بیٹھتا ہے۔ لیکن جب جب آئینے کے سامنے آتا ہے، اس پر سوالات کی بارش ہونے لگتی ہے۔ وہ اپنے آپ میں شرمندہ ہونے لگتا ہے۔ شرمندگی اس بات کی گواہ ہے کہ شاعر مفاد پرستوں کے ہاتھوں برباد ہونے سے بچ گیا ہے۔ اس کے اندر آج بھی ایک چنگاری دبی ہے جسے شعلہ بننے میں وقت لگ سکتا ہے لیکن یہ کام کچھ ایسا ناممکن بھی نہیں۔ مستقبل پہ یقین اور اچھائیوں کے زندہ ہونے کا بھروسہ ہی اس نظم کو ایک بڑی نظم بناتی ہے۔ یہ نظم انسان اور انسانیت کے زندہ ہونے کا اشاریہ ہے۔ جس خوبصورتی کے ساتھ بات آگے بڑھائی گئی ہے اور قاری کی توجہ کو نظم سے باندھے رکھنے کی کوشش کی گئی ہے، وہ ایک قصہ گو ہی کر سکتا ہے۔ بلاشبہ اختر الایمان نے اس نظم کی بنت میں ایسی دلکشی رکھی ہے جو قاری کی توجہ کو بھٹکنے نہیں دیتی۔ یہی اس نظم کی کامیابی کا راز ہے۔

☆☆☆